© rasailojaraid.com

کتاب اور حکمت عطا کی اور ملک عظیم بخشدیا، مگر ان میں سے کوئی اس پر ایمان لایا اور کوئی اس سے منہ موڑ گیا، اور منہ موڑنے والوں کے لیے تو بس جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔ جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کریں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزا چکھیں، اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور نیک عمل کیے ان کو ہم ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور انھیں ہم گھنی چھاؤں میں رکھیں گے۔

اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے اور یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انھیں اس میں سے کچھ نہیں دینا چاہتے؟ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال درپیش ہے اور اس میں بھی یہ بخل سے کام لے رہے ہیں۔

یعنی یہ اپنی نااہلی کے باوجود اللہ کے جس فضل اور جس انعام کی آس خود لگائے بیٹھے تھے، اس سے جب دوسرے لوگ سرفراز کر دیے گئے اور عرب کے اُمّیوں میں ایک عظیم الشان نبی کے ظہور سے وہ روحانی و اخلاقی اور ذہنی و عملی زندگی پیدا ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ عروج و سربلندی ہے، تو اب یہ اس پر حسد کر رہے ہیں اور یہ باتیں اسی حسد کی بنا پر ان کے منہ سے نکل رہی ہیں کہ خدا پرستوں کے مقابلہ میں بُت پرستوں کو زیادہ برسرِ ہدایت قرار دیتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) "ملک عظیم" سے مراد دنیا کی امامت و رہنمائی اور اقوام عالم پر قائدانہ اقتدار ہے جو اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کے مطابق عمل کرنے سے لازماً حاصل ہوتا ہے۔

یہ خیال رہے کہ جواب بنی اسرائیل کی حاسدانہ باتوں کا دیا جا رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جلتے کس بات پر ہو؟ تم بھی ابراہیم کی اولاد ہو اور یہ اہلِ عرب بھی ابراہیم ہی کی اولاد ہیں۔ ابراہیم سے دنیا کی امامت کا جو وعدہ ہم نے کیا تھا وہ آلِ ابراہیم میں سے صرف ان لوگوں کے لیے تھا جو ہماری بھیجی ہوئی کتاب اور حکمت کی پیروی کریں۔ یہ کتاب اور حکمت پہلے ہم نے تمھارے پاس بھیجی تھی مگر تمھاری اپنی نالائقی تھی کہ تم اس سے منہ موڑ گئے۔ اب وہی چیز ہم نے بنی اسماعیل کو دی ہے اور یہ اُن کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں[۱]، پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو
ع۸ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔[۲] یہی ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

(بقیہ سابق) خوش نصیبی ہے کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔

[۱] اوپر بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ اب روئے سخن ان کی طرف سے پلٹ کر مسلمانوں کی طرف پھر گیا ہے اور ان کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ان برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انھوں نے امانتیں، یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نا اہل، کم ظرف، پست حوصلہ، حریص اور رذیل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں، یعنی جن میں بارِ امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو۔ ان کی دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ انصاف کی رُوح سے خالی ہو گئے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف ان کے سامنے محمد رسول اللہ اور ان پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگیاں تھیں اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو بتوں کو پوج رہے تھے، بیٹیوں کو زندہ گاڑتے تھے، سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے اور کعبہ کے گرد مادر زاد ننگے ہو کر طواف کرتے تھے، مگر ان نام نہاد اہلِ کتاب کو یہ کہتے ہوئے ذرا شرم نہ آتی تھی کہ پہلے گروہ کے مقابلہ میں یہ دوسرا گروہ زیادہ برسرِ ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ انکی اس بے انصافی پر تنبیہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تم کبھی ایسے بے انصاف نہ بن جانا۔ خواہ کسی سے دوستی ہو یا دشمنی، بہرحال بات جب کہو انصاف کی کہو اور فیصلہ جب کرو عدل کے ساتھ کرو۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی مسلمانوں کی جماعت میں سے جو لوگ بھی اجتماعی معاملات انجام دینے کے ذمہ دار ہوں انکی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے۔

[۲] یعنی تمھارے ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کا طریق کار تمھارے لیے آخری فیصلہ کن چیز ہو اور ہر اختلافِ رائے کے موقع پر تم اسی مرکزی اقتدار اور اسی منبعِ علم کی طرف رجوع کرتے رہو۔ یہ نہ صرف تمھارے ایمان کا لازمی تقاضا ہے بلکہ اسی میں تمھاری خیر بھی ہے، ورنہ خدا اور رسول کی سند سے بے نیاز ہو جانے کے بعد تمھارے لیے کوئی ایسی متفق علیہ سند باقی نہ رہیگی جو صحیح بھی ہو اور متفق علیہ بھی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو تمھاری جمعیت پراگندہ ہو جائیگی یا اگر کسی کی اطاعت و پیروی پر تم متفق ہو بھی گئے تو وہ تمھیں گمراہ کر کے دین کی صراطِ مستقیم سے ہٹا لے جائیگا۔ مسلمانوں کے لیے یہ نصیحت بجائے خود نہایت قیمتی ہے مگر یہودیوں کی اخلاقی و دینی حالت پر تبصرہ کرنے کے بعد اس کا ذکر بہت معنی خیز ہے۔ یہودیوں میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں اُن کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اول تو انھوں نے خدا اور اس کے رسولوں کی اطاعت میں سخت کوتاہیاں کیں، حتیٰ کہ کھلی کھلی نافرمانیوں پر اتر آئے، پھر کتابِ الٰہی و طریقِ انبیا کی سند سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے مذہبی پیشواؤں و سیاسی سرداروں کو ارباب من دون اللہ بنا بیٹھے جس کی وجہ سے پوری اُمت گمراہ بھی ہوئی اور فرقوں میں تقسیم ہو کر پراگندہ اور بالآخر ذلیل و خوار بھی ہو کر رہ گئی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقالات

اسلام میں مرتد کا حکم

کیا حکومتِ اسلامی میں تبلیغ کفر کی اجازت ہے؟

(۳)

۳- قتلِ مرتد پر عقلی بحث

اب ہمیں سوال کے دوسرے پہلو سے بحث کرنی ہے، یعنی یہ کہ اگر اسلام میں واقعی مرتد کی سزا قتل ہے اور اگر وہ فی الواقع اپنے حدود میں کسی مقابل دعوت کے اُٹھنے اور پھیلنے کا روادار نہیں ہے، تو ہمارے پاس وہ کیا دلائل ہیں جن کی بنا پر ہم اسکے اس رویّہ کو صحیح و معقول سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے قتلِ مرتد کے مسئلہ پر گفتگو کریں گے پھر تبلیغ کفر کی ممانعت کے سوال کو لیں گے۔

قتلِ مرتد پر زیادہ سے زیادہ جو اعتراضات ممکن ہیں وہ یہ ہیں:

اولاً، یہ چیز آزادی ضمیر کے خلاف ہے۔ ہر انسان کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ جس چیز پر اُس کا قلب مطمئن ہو اُسے قبول کرے اور جس چیز پر اس کا اطمینان نہ ہو اُسے قبول نہ کرے۔ یہ آزادی جس طرح ایک مسلک کو ابتداءً قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں ہر آدمی کو ملنی چاہیے اسی طرح ایک مسلک کو قبول کرنے کے بعد اس پر قائم رہنے یا نہ رہنے کے معاملہ میں بھی حاصل ہونی چاہیے۔ جو شخص کسی مسلک کی پیروی اختیار کرنے کے بعد اُسے چھوڑنے پر آمادہ ہوتا ہے وہ آخر اسی بنا پر تو آمادہ ہوتا ہے کہ پہلے اس مسلک کے برحق ہونے کا جو یقین اُسے تھا وہ اب نہیں رہا۔ پھر یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ عدمِ یقین کی بنا پر جب وہ اس مسلک کو چھوڑنے کا ارادہ کرے تو اس کے سامنے پھانسی کا تختہ پیش کر دیا جائے۔ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ تم جس شخص کی رائے دلائل سے نہیں بدل سکتے اسکو موت کا خوف دلا کر مجبور کرتے ہو کہ اپنی رائے بدلے اور اگر وہ نہیں بدلتا تو اسے اس بات کی سزا دیتے ہو کہ اس نے اپنی رائے کیوں نہ بدلی۔

ثانیاً، جو رائے اس طرح جبراً بدلی جائے، یا جس رائے پر سزائے موت کے خوف سے لوگ قائم رہیں وہ بہر حال ایماندارانہ رائے تو نہیں ہو سکتی۔ اس کی حیثیت محض ایک ایسے منافقانہ اظہار رائے کی ہوگی جسے جان بچانے کے لیے مکر کے طور پر اختیار کیا گیا ہو۔ آخر اس مکاری و منافقت سے ایک مذہب کس طرح مطمئن ہو سکتا ہے؟ مذہب و مسلک خواہ کوئی سا بھی ہو اس کی پیروی کوئی معنی نہیں رکھتی اگر آدمی سچے دل سے اس پر ایمان نہ رکھتا ہو اور ایمان ظاہر ہے کہ زبردستی کسی کے اندر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پیدا نہیں کیا جا سکتا نہ زبردستی باقی رکھا جا سکتا ہے۔ زور زبردستی سے آدمی کی گردن ضرور جھکوائی جا سکتی ہے لیکن دل و دماغ میں اعتقاد و یقین پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جو شخص اندر سے کافر ہو چکا ہو وہ اگر سزائے موت سے بچنے کے لیے منافقانہ طریقہ سے بظاہر مسلمان بنا رہے تو اس کا فائدہ کیا ہے؟ نہ وہ اسلام کا صحیح پیرو ہوگا، نہ خدا کے ہاں یہ ظاہری اسلام اس کی نجات کا ذریعہ ہو سکتا ہے اور نہ ایسے شخص کے شامل رہنے سے مسلمانوں کی جماعت میں کسی صالح عنصر کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

ثالثاً، اگر اس قاعدہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ ایک مذہب ان تمام لوگوں کو اپنی پیروی پر مجبور کرنے کا حق رکھتا ہے جو ایک مرتبہ اس کے حلقہ اتباع میں داخل ہو چکے ہوں، اور اس کے لیے اپنے دائرہ سے نکلنے والوں کو سزائے موت دینا جائز ہے، تو اس سے تمام مذاہب کی تبلیغ و اشاعت کا دروازہ بند ہو جائے گا اور خود اسلام کے راستہ میں بھی یہ چیز سخت رکاوٹ بن جائے گی، کیونکہ جتنے انسان ہیں وہ بہرحال کسی نہ کسی مذہب و مسلک کے پیرو ضرور ہیں، اور جب ہر مذہب ارتداد کی سزا قتل تجویز کریگا تو صرف یہی نہ ہوگا کہ مسلمانوں کے لیے کسی دوسرے مذہب کو قبول کرنا مشکل ہو گا بلکہ اسی طرح غیر مسلموں کے لیے بھی اسلام کو قبول کرنا مشکل ہو جائے گا۔

رابعاً، اس معاملہ میں اسلام نے بالکل ایک متناقض رویہ اختیار کیا ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں (لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ) جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے (فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ)، اور دوسری طرف وہ خود ہی اس شخص کو سزائے موت کی دھمکی دیتا ہے جو اسلام سے نکلکر کفر کی طرف جانے کا ارادہ کرے۔ ایک طرف وہ نفاق کی سخت مذمت کرتا ہے اور اپنے پیرووں کو صادق الایمان دیکھنا چاہتا ہے، دوسری طرف وہ خود ہی ایسے مسلمانوں کو جن کا اعتقاد اسلام پر سے اٹھ گیا ہے موت کا خوف دلا کر منافقانہ اظہار ایمان پر مجبور کرتا ہے۔ ایک طرف وہ ان غیر مسلموں کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے جو اپنے ہم مذہبوں کو اسلام قبول کرنے سے روکتے ہیں، دوسری طرف وہ خود مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ تمھارے ہم مذہبوں میں سے جو کسی دوسرے مذہب میں جانا چاہے اُسے قتل کر دو۔

یہ اعتراضات بظاہر اتنے قوی نظر آتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو تو ان کے مقابلہ میں ہار مان کر شکست خوردہ لوگوں کی اس آنی پالیسی پر عمل کرنا پڑا کہ اپنے دین کے جس مسئلے پر معترضین کی گرفت مضبوط پڑے اُسے اپنی کتاب آئین میں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چھیل ڈالو اور صاف کہہ دو کہ یہ مسئلہ سرے سے ہمارے دین میں ہے ہی نہیں۔ رہا دوسرا گروہ جس کے لیے پہلے گروہ کی طرح حقیقت کا انکار کر دینا ممکن نہ تھا، سو اُس نے امرِ واقعی کے اظہار کا حق تو ادا کر دیا، لیکن اِن عقلی اعتراضات کا کوئی معقول جواب اس سے بن نہ پڑا حتیٰ کہ اس کی کمزور دلیلوں سے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ بات بیٹھ گئی کہ قتلِ مرتد کا حکم اسلام میں ہے تو ضرور مگر اسے معقول ثابت کرنا مشکل ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اب سے تقریباً ۱۸ برس پہلے جب ہندوستان میں ایک موقع پر قتلِ مرتد کا مسئلہ زور شور سے چھڑ گیا تھا اور چاروں طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی تھی اس وقت مولانا محمد علی مرحوم جیسا سچا مسلمان بھی ان دلائل سے شکست کھائے بغیر نہ رہ سکا، اور علماء میں سے متعدد بزرگوں نے اگرچہ مسئلہ ویسا ہی بیان کیا جیسا کہ فی الواقع وہ تھا مگر اعتراضات کے جواب میں ایسی بے جان دلیلیں پیش کیں جن سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ خود بھی اپنے دلوں میں اس مسئلے کو عقلی حیثیت سے کمزور محسوس کر رہے ہیں۔ اس ضعیف مدافعت کے اثرات آج تک باقی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کی حیثیت فی الواقع اُسی معنی میں ایک "مذہب" کی ہوتی جس معنی میں یہ لفظ آج کل بولا جاتا ہے تو یقیناً اس کا اُن لوگوں کے لیے قتل کی سزا تجویز کرنا سخت غیر معقول فعل ہوتا جو اس کے اصولوں سے غیر مطمئن ہو کر اس کے دائرہ سے باہر نکلنا چاہیں۔ مذہب کا موجودہ تصور یہ ہے کہ مابعد الطبیعی مسائل کے متعلق ایک عقیدہ و خیال جسے آدمی اختیار کرتا ہے اور حیات بعد الموت میں نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ جس پر انسان اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ رہی سوسائٹی کی تنظیم اور معاملاتِ دنیا کی انجام دہی اور ریاست کی تشکیل تو وہ ایک خالص دنیوی معاملہ ہے جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ اس تصور کے مطابق مذہب کی حیثیت صرف ایک رائے کی ہے اور رائے بھی ایسی جو زندگی کے ایک بالکل ہی دور از کار پہلو سے تعلق رکھتی ہے جس کے قائم ہونے اور بدلنے کا کوئی قابلِ لحاظ اثر حیاتِ انسانی کے بڑے اور اہم شعبوں پر نہیں پڑتا۔ ایسی رائے کے معاملہ میں آدمی کو آزاد ہونا ہی چاہیے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ امورِ مابعد الطبیعت کے بارے میں ایک خاص رائے کو اختیار کرنے میں تو وہ آزاد ہو، مگر جب اس کے سامنے کچھ دوسرے دلائل آئیں جن کی بنا پر وہ سابق رائے کو غلط محسوس کرنے لگے تو اس کے بدل دینے میں وہ آزاد نہ ہو۔ اور اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ جب ایک طریقہ کی پیروی میں اُسے اپنی نجاتِ اُخروی کی توقع ہو تو وہ اُسے اختیار کر سکے اور جب وہ محسوس کرے کہ نجات کی امید اس راستہ میں نہیں، کسی دوسرے راستہ میں ہے تو اُسے پچھلے راستہ کو چھوڑنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور نئے راستے کے اختیار کرلینے کا حق نہ دیا جائے۔ پس اگر اسلام کی حیثیت بھی تنہا ایک مذہب کی حیثیت (آجکل قرار دیا گیا ہے) ہوتی تو اس سے زیادہ نامعقول کوئی بات نہ ہوتی کہ وہ آنے والوں کے لیے تو اپنا دروازہ کھلا رکھے مگر جانے والوں کے لیے دروازے پر جلاد بٹھا دے۔

لیکن دراصل اسلام کی یہ حیثیت سرے سے ہے ہی نہیں۔ وہ اصطلاحِ جدید کے مطابق محض ایک "مذہب" نہیں ہے بلکہ ایک پورا نظامِ زندگی ہے، اُس کا تعلق صرف مابعد الطبیعت ہی سے نہیں ہے بلکہ طبیعت اور ماتحت الطبیعت سے بھی ہے، وہ محض حیات بعد الموت کی نجات ہی سے بحث نہیں کرتا بلکہ حیات قبل الموت کی فلاح و بہتری اور تشکیلِ صحیح کے سوال سے بھی بحث کرتا ہے۔ مانا کہ پھر بھی وہ ایک رائے ہی ہے مگر وہ رائے نہیں جو زندگی کے کسی دور از کار پہلو سے تعلق رکھتی ہو بلکہ وہ رائے جس کی بنیاد پر پوری زندگی کا نقشہ قائم ہوتا ہے، وہ رائے نہیں جس کے قائم ہونے اور بدلنے کا کوئی قابلِ لحاظ اثر زندگی کے بڑے اور اہم شعبوں پر نہ پڑتا ہو بلکہ وہ رائے جس کے قیام پر تمدن اور ریاست کا قیام منحصر ہے اور جس کے بدلنے کے معنی نظامِ تمدن و ریاست کے بدل جانے کے ہیں، وہ رائے نہیں جو صرف انفرادی طور پر ایک شخص اختیار کرتا ہو بلکہ وہ رائے جس کی بنا پر انسانوں کی ایک جماعت تمدن کے پورے نظام کو ایک خاص شکل پر قائم کرتی ہے اور اسے چلانے کے لیے ایک ریاست وجود میں لاتی ہے۔ ایسی رائے اور ایسے نظریہ کو انفرادی آزادیوں کا کھلونا نہیں بنایا جاسکتا اور نہ اُس جماعت کو، جو اس رائے پر تمدن و ریاست کا نظام قائم کرتی ہے، رہگذر بنایا جاسکتا ہے کہ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اُٹھے تو اس میں داخل ہوجائیے اور جب دوسری لہر اُٹھے تو اس سے نکل جائیے اور پھر جب جی چاہے اندر آئیے اور جب جی چاہے باہر چلے جائیے۔ یہ کوئی کھیل اور تفریح نہیں ہے جس سے بالکل ایک غیر ذمہ دارانہ طریقہ پر دل بہلایا جائے۔ یہ تو ایک نہایت سنجیدہ اور انتہائی نزاکت رکھنے والا کام ہے جس کے ذرا ذرا سے نشیب و فراز سوسائٹی اور اسٹیٹ کے نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں، جس کے بننے اور بگڑنے کے ساتھ لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا کی زندگیوں کا بناؤ اور بگاڑ وابستہ ہوتا ہے، جس کی انجام دہی میں ایک بہت بڑی جماعت اپنی زندگی و موت کی بازی لگاتی ہے۔ ایسی رائے اور ایسی رائے رکھنے والی جماعت کی رکنیت کو انفرادی آزادیوں کا کھلونا دنیا میں کب بنایا گیا ہے اور کون بناتا ہے کہ اسلام سے اس کی توقع رکھی جائے۔

یہ منظم سوسائٹی اور ریاست کی عین فطرت کا اقتضا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لیے اپنے حدودِ عمل میں مشکل ہی گنجائش نکال سکتی ہے جو اساسیات میں اس سے اختلاف رکھتے ہوں۔ فروعی اختلافات تو کم و بیش برداشت کیے جاسکتے ہیں، لیکن جو لوگ سرے سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان بنیادوں ہی سے اختلاف رکھتے ہوں جن پر سوسائٹی اور ریاست کا نظام قائم ہوا ہو، اُن کو سوسائٹی میں جگہ دینا اور اسٹیٹ کا جز بنانا سخت مشکل ہے۔ اسلام نے اس معاملہ میں جتنی رواداری برتی ہے کسی دوسرے نظام نے نہیں برتی۔ دوسرے جتنے نظام ہیں وہ اساسی اختلاف رکھنے والوں کو یا تو زبردستی اپنے اصولوں کا پابند بناتے ہیں یا انھیں بالکل فنا کردیتے ہیں۔ وہ صرف اسلام ہی ہے جو ایسے لوگوں کو ذمّی بنا کر اور انھیں زیادہ سے زیادہ ممکن آزادیٔ عمل دے کر اپنے حدود میں جگہ دیتا ہے اور ان کے بہت سے ایسے اعمال کو برداشت کرتا ہے جو براہِ راست اسلامی سوسائٹی اور اسٹیٹ کی اساس سے متصادم ہوتے ہیں۔ اس رواداری کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلام انسانی فطرت سے مایوس نہیں ہے، وہ خدا کے بندوں سے آخر وقت تک یہ اُمید وابستہ رکھتا ہے کہ جب انھیں دینِ حق کے ماتحت رکھ کر اس کی نعمتوں اور برکتوں کے مشاہدہ کا موقع ملے گا تو بالآخر وہ اس حق کو قبول کرلیں گے جس کی روشنی فی الحال انھیں نظر نہیں آتی۔ اسی لیے وہ صبر سے کام لیتا ہے اور اُن سنگریزوں کو جو اس کی سوسائٹی اور ریاست میں حل نہیں ہوتے اس امید پر برداشت کرتا رہتا ہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی قلبِ ماہیت ہو جائے گی اور وہ تحلیل ہونا قبول کرلیں گے۔ لیکن جو سنگریزہ ایک مرتبہ تحلیل ہونے کے بعد پھر سنگریزہ بن جائے اور ثابت کر دے کہ وہ سرے سے اس نظام میں حل ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا، اس کا کوئی علاج اس کے سوا نہیں کہ اُسے نکال کر پھینک دیا جائے۔ اس کی انفرادی ہستی خواہ کتنی ہی قیمتی ہو، مگر بہرحال وہ اتنی قیمتی تو نہیں ہوسکتی کہ سوسائٹی کے پورے نظام کی خرابی اس کی خاطر گوارا کی جائے۔

قتلِ مرتد کو جو شخص یہ معنی پہناتا ہے کہ یہ محض ایک رائے کو اختیار کرنے کے بعد اسے بدل دینے کی سزا ہے وہ دراصل ایک معاملہ کو پہلے خود ہی غلط طریقہ سے تعبیر کرتا ہے اور پھر خود ہی اس پر ایک غلط حکم لگاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کرچکا ہوں، مرتد کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنے ارتداد سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے کہ سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تنظیم جس بنیاد پر کی گئی ہے اس کو وہ نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کرتا بلکہ اس سے کبھی آئندہ بھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ اسے قبول کرے گا۔ ایسے شخص کے لیے مناسب یہ ہے کہ جب وہ اپنے لیے اُس بنیاد کو ناقابلِ قبول پاتا ہے جس پر سوسائٹی اور اسٹیٹ کی تعمیر ہوئی ہے تو خود اس کے حدود سے نکل جائے۔ مگر جب وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کے لیے دو ہی علاج ممکن ہیں، یا تو اسے اسٹیٹ میں تمام حقوقِ شہریت سے محروم کرکے زندہ رہنے دیا جائے یا پھر اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا جائے۔ پہلی صورت فی الواقع دوسری صورت سے شدید تر سزا ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْییٰ کی حالت میں

© rasailojaraid.com